غالب کی اُردو نثر کا سیاسی اور سماجی تجزیہ

فاروق احمد، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Ghalib, an undoubtedly the most renowned name not only in Urdu poetry but in prose as well. His prose helps to understand the contemporary issues of Ghalib's era. This article analyzes the political and social aspects which are prominent in Ghalib's prose.

اُردو نثر میں غالب کا سرمایہ زیادہ تر ان کے خطوط ہیں۔ مرزا غالب نے اپنی جدّت پسند طبیعت اور نکتہ رس ذہن کی بدولت اُردو نثر کے قالب میں زندگی کی نئی روح پھونکی۔ غالب نے جو خط اپنے عزیز و اقارب، دوستوں، شاگردوں، ہم عصروں اور بعض دیگر سرکاری شخصیات کو لکھے، اُن کی بہت سی جہات ہیں۔ یہ خطوط وہ آئینہ ہیں، جن میں ہم غالب کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کی بھرپور جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔

اُردو نثر کا باقاعدہ آغاز اگرچہ دکن میں بہمنی عہد سے ہوا اور قطب شاہی عہد میں اُردو نثر کا ایک عظیم ادبی کارنامہ مُلّا وجہی کی 'سب رس' ہے، لیکن اُردو نثر کے ان دکنی نمونوں سے شمالی ہند والے تقریباً انیسویں صدی کے آخر تک بے خبر تھے۔ اس لیے اگر ’’کربل کتھا‘‘ کو اس کے مؤلف کے دعوے کی روشنی میں ایک عرصے تک اُردو کی پہلی نثری تالیف کہا جاتا رہا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ اس لیے غالب تک اُردو نثر کا جو ارتقائی سلسلہ ملتا ہے اس کی ابتدا ’’کربل کتھا‘‘ ہی سے ہوئی، جس کے مولف کا یہ دعویٰ اس اعتبار سے قابل لحاظ ہے: ’’پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمۂ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں مستمع۔‘‘[۱]

فورٹ ولیم کالج میں اُردو نثر کا جو کام ہوا، وہ ایک سیاسی تقاضے کے تحت تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا تھا۔ تاریخ کا فیصلہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ مغلوں کی دفتری زبان فارسی تھی۔ نئے دفتری نظام کے لیے زبان کی تبدیلی سیاسی لحاظ سے بہت ضروری تھی۔ فارسی کی جگہ فوری طور پر انگریزی نہیں لے سکتی تھی۔ انتظامی لحاظ سے بھی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی، اس موقع پر انگریزی کو لانا غیر مفید تھا۔ ان حالات میں اُردو ہی ایک ایسی زبان تھی، جو اس وقت تبدیلی کے لیے موزوں تر تھی۔ چنانچہ جو تجربہ فورٹ ولیم کالج میں ہوا، اس کے نتائج کچھ عرصہ بعد دفتری زبان کی تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ ۱۸۳۲ء میں دفتری زبان اُردو ہو گی۔ اسی زمانے میں اُردو اخبارات بھی نکلنے لگے۔ مذہبی تبلیغ کے لیے بھی اُردو سے کام لیا جانے لگا۔ اگرچہ مستقبل کے دفتری تقاضوں کے لیے ۱۸۳۵ء میں انگریزی زبان ذریعۂ تعلیم بنا دی گئی، تاہم دہلی کالج

میں اُردو ہی ذریعہ تعلیم رہی اور اس کالج کی تعلیمی و نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی۔ اُردو نثر کے فروغ کا یہ نقطۂ ارتقا غالب کی نگاہوں کے سامنے تھا۔[۲] اس دَور میں داستانیں لکھی جاتی تھیں، ان کو پڑھا بھی جاتا تھا اور سنایا بھی جاتا تھا۔ مشاعرے کی طرح داستان گوئی ایک تہذیبی ادارے کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں کہ ''غالب کو بھی داستانوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ شراب کی بوتلیں اور ضخیم داستانیں ان کا دل پسند مشغلہ تھیں۔''[۳] فروغ اُردو کے اس ماحول میں غالب بھی بعض ضرورتوں اور مجبوریوں کے تحت اُردو نثر (خطوط نگاری) کی طرف مائل ہوئے اور پھر یہی ضرورت یا مجبوری کچھ عرصے بعد ایک عادت بن کر ان کے لیے راحت و دلچسپی کا ذریعہ بن گئی۔ اس طرح تاریخ نے اُردو نثر کو ایک ایسا صاحب طرز ادیب دیا جس نے اپنے انداز خاص میں اُردو نثر کے قالب میں نئی روح پھونکی۔

غالب کی اُردو نثر کے سیاسی اور سماجی تجزیاتی مطالعہ سے پہلے ہم غالب کے دَور کے سیاسی اور سماجی حالات کا مختصر سا جائزہ لیں گے۔ برّعظیم پاک و ہند میں مغل سلطنت کے انحطاط کے ساتھ سیاسی کشمکش کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ غالب کے زمانے تک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ ملک کے بیشتر حصّوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری قائم ہو گئی تھی۔ مرہٹہ جنگ میں لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں آگرہ سے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کیا۔ مرزا غالب کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ ان فتوحات میں جنرل لیک کے ساتھ تھے۔ فتح دہلی کے بعد کٹ پتلی بادشاہ (شاہ عالم ثانی) جو پہلے مرہٹوں کے زیر اثر تھا، اب کمپنی کے کنٹرول میں آ گیا۔ اس کے بعد برّعظیم میں کوئی ایسی بڑی قوت موجود نہیں تھی جو کمپنی کی یلغار کو روک سکے۔ اس طرح عملاً سارا مُلک ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں آ چکا تھا اور کشت و خون کا وہ بازار قدرے سرد پڑ گیا تھا جو اٹھارویں صدی میں مغلوں کے مرکزی نظام حکومت کی کمزوری کی وجہ سے خاصا گرم رہا تھا۔ نظم و نسق کے قیام سے اجتماعی زندگی بظاہر پُرسکون ہو گی تھی۔ کاروبار، رسل و رسائل اور زراعت وغیرہ معمول پر آ گئے تھے۔ اُجڑے ہوئے نگر آباد ہونے لگے۔ کمپنی کی حکومت کا مرکز اگرچہ کلکتہ تھا لیکن دہلی، انگریزی تسلط کے بعد پھر آباد ہونے اور اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے لگی۔ لال قلعے کا شاہی اقتدار تو ایک عرصہ پہلے ختم ہو چکا تھا لیکن برائے نام مُغل بادشاہ کے نام سے اس کا ایک بھرم سا باقی رہ گیا تھا۔

سیاسی کشمکش یا جنگ وجدل کا سلسلہ ختم ہو کر ماحول بظاہر پُرسکون ہو گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ذہنی کشمکش اور نفسیاتی جنگ کا ایک دوسرا مرحلہ شروع ہو گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار نے ملک سے بدامنی اور شورش تو ختم کر دی، لیکن خود یہ اقتدار جس صورت میں قائم ہوا، وہ یہاں کے تاریخی حالات اور تہذیبی روایات کے منافی تھا۔ اگر مغل سلطنت کو ختم کر کے برسر اقتدار آنے والی طاقت یہاں کے حالات و روایات کے مطابق ہوتی اور حاکم و محکوم کے درمیان رنگ و نسل اور تہذیب و تمدن کی اجنبیت کی اُونچی اُونچی دیواریں نہ ہوتیں، تو یہ انقلاب، حکومت اور ملک کے لیے بڑا خوش آئند ہوتا۔

کمپنی کی حکومت کے قیام کے ساتھ جو معاشی، تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی تبدیلیاں ظہور میں آ رہی تھیں، اُن کو عوام بجا طور پر شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن عملاً بے بس ہو چکے تھے، اس لیے بے چینی اور اضطراب کی ایک داخلی لہر تھی جو قلب و ذہن میں پھیلتی جا رہی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ذہنی و جذباتی کشمکش کا یہ سلسلہ شروع ہوا۔ کمپنی کے مقبوضات میں توسیع کے ساتھ ساتھ یہ اندرونی اضطراب بھی بڑھتا گیا۔'' حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں یہ آتش فشاں لاوا انتہا تک

پہنچ کر پھٹ پڑا۔ لاکھوں انسانوں کی قربانی لے کر یہ آگ فرو ہوئی اور برّعظیم پر اجنبی سامراج کا تسلط ایک تاریخی حقیقت بن گیا۔''[۴]

غالب کی نثر کے سیاسی اور سماجی پس منظر کے مطالعے سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ غالب نے معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ایک ہمدرد اور انسان دوست نثر نگار کی نظر سے دیکھا۔ اپنے عہد میں انسانی قدروں کے زوال اور بنی آدم کی عام بے قدری اور ذلت کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ایک فرض شناس معلم اور ایک حساس و باشعور فن کار کی طرح اپنے دوستوں اور شاگردوں کو خطوط کے ذریعے تلقین و ہدایت بھی کی ہے۔ اکثر خطوط میں مرزا غالب نے اپنے شاگردوں اور احباب کی اصلاح بھی کی ہے، انہیں اُردو اور فارسی زبان کی باریکیوں سے آگاہ کیا ہے۔ ان خطوط کی ہر سطر غالب کے عہد کی ترجمان اور ان کے حالات کی عکاس ہے۔

اکثر خطوط میں انہوں نے اپنے معاشی حالات کے بگاڑ کا ذکر کیا اور ایسے مقامات پر قاری یہ حقیقت جان جاتا ہے کہ بچپن سے بڑھاپے تک غالب نے بار بار مشکلات اور مصائب کا سامنا کیا۔ جو زندگی انہوں نے گزاری اسے کسی بھی صورت میں فارغ البالی یا خوشحالی کی زندگی کہنا دشوار ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے تک سارا معاشرہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ تہذیب ابھی زندہ ہے لیکن غدر کے بعد یہ طرزِ فکر ایک دم بدل گیا اور ہر چیز کا دستور تیزی سے بدلنے لگا۔ رسل و رسائل کی آسانیاں بڑھ گئیں، تجارت کے راستے کھُل گئے۔ ریل گاڑی کا جال سارے ہندوستان میں بچھنے لگا۔ ڈاک کا نظام جدید خطوط پر استوار ہوا۔ اب لوگ ملازمتوں کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے لگے۔ اس طرح غالب کے بہت سے دوست و احباب اُن سے دُور چلے گئے اور کچھ غدر کے بعد کی سنگین صورتِ حال کی وجہ سے دُور دراز گوشوں میں جا چھپے اور کچھ پھانسی چڑھا دیے گئے اور غالب دلّی میں تنہا رہ گئے۔ اب اپنی تنہائی کو دُور کرنے اور دوستوں سے بات چیت کرنے کا واحد ذریعہ خط تھا جسے غالب نے پوری طرح استعمال کیا۔ ایک خط میں ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ:

> ''میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے سے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا وہ شخص تشریف لایا۔ خُدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں، بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو، ایک دو شام کو، میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔''[۵]

جن دوستوں سے شب و روز ملاقاتیں ہوتی تھیں، مسائل روزمرہ پر گفتگو ہوتی تھیں، نجی و ذاتی معاملات پر راز و نیاز کی باتیں ہوتی تھیں، وہ سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اس مجلسی خلا کو پُر کرنے اور ویرانۂ دل کو آباد کرنے کا اب صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ تھا مکتوب نگاری۔ ویرانیِ دل کے تلخ احساس اور اس کے مداوے کی چند مثالیں دیکھیے:

> ''کیوں صاحب! مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔''[۶]

> ''نور چشم، راحت جان، میر سرفراز حسین جیتے رہو۔ تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا، جو بوئے

> پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا۔ میاں، یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان، توانا ہیں یا ناتواں ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں یعنی بہرحال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے:
>
> یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
> یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ
>
> وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ، اللہ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں۔ میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟ سنو غالب، رونا پیٹنا کیا۔ کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میر مہدی کو پڑھواؤ اور میرن صاحب کو بلاؤ۔‘‘[۷]

برسات میں ہمارے معاشرے میں، جن غریب لوگوں کے پاس کچے مکان ہوتے ہیں اور بارش مسلسل کئی کئی دنوں تک ہوتی رہتی ہے، وہ برسات کے موسم میں مشکلات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غالب، صاحب حیثیت تھے وہ بھی برسات سے پریشان ہو جاتے تھے تو اُس دَور میں معاشرے کے عام لوگوں کا کیا حال ہو گا۔ برسات کے موسم میں اندھیری راتوں میں چوریاں بھی ہوتی ہیں۔ برسات کے موسم میں مکانوں کے گرنے سے لوگ مر جاتے ہیں، بڑی تباہی ہوتی ہے۔

خطوط غالب میں برسات کی تباہی کے تمام نقشے ملتے ہیں۔ یہ بیان غالب کی زبان سے سنیے:

> ’’برسات کا نام آ گیا، سو پہلے مجملاً سنو ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آ جاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہزارہا مکان گر گئے۔ سینکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے، پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے جنہوں نے ابھی نہیں بویا تھا وہ بونے سے رہ گئے، سن لیا، دلّی کا حال؟‘‘[۸]

غالب میر مہدی مجروح کے نام لکھتے ہیں کہ:

> ’’برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کا جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی تھیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے، چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلمدان سب توشے خانے میں، فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری

ہوئی۔‘‘[۹]

خطوط غالب اگر ایک طرف ان کی شخصیت کی نمائندگی کرتے ہیں تو دوسری طرف تاریخی، معاشی، سیاسی اور سماجی حالات کے آئینہ دار بھی ہیں۔ کسی بھی ادیب یا شاعر کی تخلیقات میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس دَور کی معاشرت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتی ہے۔ یہ خوبی غالب کے خطوط میں بھی ہے۔ اس میں جابجا معاشرتی رنگ بکھرا ہوا ہے۔ ان کے خطوط کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم غالب ہی کے زمانے میں زندگی گزار رہے ہیں۔

اس عہد کے آدابِ معاشرت میں شرفا کو اپنی عزت و آبرو کا بہت پاس رہتا تھا، کوئی ایسی بات جو ان کے یا اہل خانہ کے شایان شان نہ ہو اس سے پرہیز کرتے تھے۔ مثال کے طور پردہ بازار میں یا سر راہ گفتگو کرنے کو معیوب سمجھتے تھے، ان کے یہاں کی نوکرانیاں بھی اگر راستے میں کسی سے ہم کلام ہوتیں تو اسے بھی عیب سمجھا جاتا۔ غالب کی ایک نوکرانی بی وفادار تھی اس سے متعلق علائی کو نہایت دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں:

> ’’بی وفادار جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمہاری پھوپھی نے انہیں وفا دار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے ہی باتیں کرتی پھرتی ہیں۔‘‘[۱۰]

غالب کے عہد میں حفظ مراتب کا بہت خیال کیا جاتا تھا۔ اگر کوئی عمر میں چھوٹا ہے تو اسے دُعا دینے کا رواج تھا، اگر کوئی برابر کا ہے یا دوست ہے تو اس کے لیے سلام تھا اور استاد کے لیے بندگی کہی جاتی، اگر کوئی سیّد ہوتا تو اس کے لیے لفظ درود تھا۔ ان تمام مراتب کا ذکر مجموعی طور پر غالب نے علائی کے نام اپنے ایک خط میں کیا ہے اور یہ اُستاد میر جان کے لیے لکھا ہے جو دُور کے عزیز بھی تھے اور غالب کا ان سے چھیڑ چھاڑ کا رشتہ تھا۔ اندازِ بیان ملاحظہ ہو:

> ’’استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں دُعا اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کم وبیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے سلام اور اس سبب سے کہ استاد ہیں بندگی اور اس نظر سے کہ یہ سیّد ہیں درود۔‘‘[۱۱]

غالب کے خطوط میں خورد ونوش کی اشیا کا ذکر بھی اس عہد کی معاشرت کا ایک اہم پہلو واضح کرتا ہے۔ اس معاشرت میں کھانے کی مختلف چیزیں استعمال ہوتی تھیں۔ خود غالب کے دستر خوان پر کئی چیزیں ہوتی تھیں۔ ’’خصی بکروں کے گوشت کے قلیے، دو پیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو، مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آیا ہو۔‘‘[۱۲]

مرزا شہاب الدین خاں کو لکھتے ہیں کہ:

> ’’ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخودار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گی تھی، شراب پی، کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہری کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا، ترکاری نہ ڈلوائی۔‘‘[۱۳]

غالب اپنی مختلف بیماریوں کا ذکر کرتے ہیں۔ حکیم سیّد احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

> ’’آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے جہاں تک ہو سکے احباب کی خدمت بجا لایا، اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہات سے اچھی طرح لکھا جائے۔‘‘[۱۴]

میر حبیب اللہ ذکاء سے اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہیں:

> ’’میں برس دن سے بیمار اور تین مہینے سے صاحب فراش ہوں۔ اُٹھنے بیٹھنے کی طاقت مفقود۔ پھوڑوں سے بدن لالہ زار، پوست سے ہڈیاں نمودار، پھوڑے ایسے جیسے انگارے سلگتے ہیں۔ اعضاء پر دس جگہ پھائے لگتے ہیں۔‘‘[۱۵]

منشی ہرگوپال تفتہ کو خط میں لکھتے ہیں کہ ’’سامعہ مر گیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا تھا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں، سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔‘‘[۱۶] ’’بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرضدار، کانوں کا بہرا، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا امیدوار۔‘‘[۱۷]

غالب کی تحریر میں ایک درد کا احساس ہوتا ہے، ان کے ایک ایک لفظ سے کرب کی فضا بنتی چلی جاتی ہے۔ دلّی جو ایک تہذیب کا نام تھا، اس کی تباہی کا منظر غالب جیسے حساس شخص کو دیکھنے کو ملا، وہ اس اجڑتی اور لٹتی ہوئی تہذیب کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتے ہیں، علاؤ الدین احمد خاں علائی کو ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

> ’’اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں، جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلّی نہیں جس میں سات برس کی عمر میں آتا جاتا ہوں، وہ دلّی نہیں جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کمپ ہے، مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔‘‘[۱۸]

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء میں برعظیم کے سب باشندے بلا امتیاز مذہب و ملت شریک تھے۔ لیکن آتش انقلاب کے فرو ہونے کے بعد برطانوی حکومت نے سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپا۔ ہندوؤں کی حوصلہ افزائی اور مسلمانوں کی بیخ کنی کا سلسلہ شروع کیا۔ دہلی میں مسلمانوں کو شہر بدر کرنے کے اکثر واقعات خطوط غالب میں بیان ہوئے ہیں، جن سے ہندو مسلم کی اس نئی سامراجی تفریق کا اظہار ہوتا ہے۔

> ’’دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پُل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔‘‘[۱۹]
>
> ’’میرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو۔ دلّی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں مماف اور نقاش کہاں؟‘‘[۲۰]
>
> ’’اللہ اللہ دلّی نہ رہی اور دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں؟ دلّی واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاونی ہے۔ نہ قلعہ نہ

> شہر نہ بازار نہ نہر۔‘‘[۲۱]
>
> ’’ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گے، جو زندہ ہیں اُن میں سینکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں ...... جو زندہ ہے، اُس میں مَقدور نہیں۔‘‘ [۲۲]
>
> ’’مُنہ پیٹتا ہوں اور سَر ٹپکتا ہوں کہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا۔ الٰہی حیات جاودانی نہیں مانگتا، پہلے انورالدولہ سے مِل کر سرگزشت بیان کروں، پھر اس کے بعد مروں۔‘‘[۲۳]
>
> ’’میں تم کو لکھ چکا ہوں کہ دلّی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آ کر کیا کرو گئے۔‘‘[۲۴]

مرزا غالب کی پنشن بند ہونے کا ان کے احباب کو بہت دکھ تھا۔ اس پورے عرصے میں دوستوں نے مرزا سے خوب ہمدردی کی۔ اکثر احباب اپنے خطوط میں پنشن کے معاملے اور مقدمے کا حال پوچھتے تھے۔ ایک بار میر مہدی نے جب اسی حوالے سے خط لکھا تو جواباً مرزا نے لکھا:

> ’’میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزے کھا کھا کر کاٹا۔ آئندہ خدا رازق ہے کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب جب ایک چیز کھانے کو ہوئی اگرچہ غم ہی ہو تو پھر کیا غم ہے؟‘‘[۲۵]

میر مہدی مجروؔح کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ ’’تم کو پنشن کی کیا جلدی ہے؟ ہر بار پنشن کو کیوں پوچھتے ہو؟ پنشن جاری ہو تو میں تم کو اطلاع نہ دوں، ابھی تک کچھ حکم نہیں۔ دیکھوں، کیا حکم ہو اور کب ہو؟‘‘ [۲۶] ’’پنشن کا حال کچھ معلوم ہوا تو کیوں۔‘‘[۲۷] ’’سنو پنشن کی رپورٹ کا بھی کچھ حال معلوم نہیں۔ دیر آید درست آید۔‘‘ [۲۸] غالب کی نثر سے معاشرتی ماحول کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ غالب کے دَور کی معاشرت میں امرا و شرفا کی زندگی عوام سے مختلف تھی۔ ان کے رہنے سہنے، ملنے جلنے اور اُٹھنے بیٹھنے کا انداز جُدا تھا۔ اسی طرح جب کوئی شخص کسی کے یہاں جاتا تو جانے سے قبل اپنے آنے کی اطلاع دے دیتا تھا اگر کبھی بغیر بتائے کوئی شخص کسی کے یہاں چلا جاتا تو یہ بات خلاف معمول ہوتی۔

غالب کے خطوط، غالب کی زندگی اور ان کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ کسی بھی آرائش بیان سے پاک یہ بالکل شفاف تحریریں ہیں جن میں بیان ہونے والے بیشتر حقائق فکشن سے زیادہ چسکے دار لگتے ہیں۔ زندگی نے اسے کتنا رسوا اور ذلیل کیا ہے۔ غالب یہ خوب جانتا ہے اس لیے اس سے پہلے کہ کوئی اور اس کا مضحکہ اُڑائے، اس نے اپنا مذاق اُڑانے کا حق خود اپنے پاس رکھا ہے۔ ایسے واقعات سے غالب معاشرے کو تجاویز اور مشورے بھی دیتے ہیں کہ ایسے مشکل مسائل اور باتوں سے بچا جائے۔ جب غالب جیسے نامور آدمی کا معاشرے میں یہ مقام ہے تو عام آدمی کا کیا حال ہو گا۔

اب ذرا یہ بھی سنیے کہ وہ مرزا قربان علی بیگ خاں سالک سے کیا دکھڑا رو رہے ہیں:

> ’’اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو غالب کے ایک جوتی اور لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دُور دُور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے ’’جنت آرام گاہ‘‘ و ’’عرش

> نشین'' خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہِ قلمروِ سخن جانتا تھا ''سقر مقر'' اور ''ہاویہ زاویہ'' خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر، ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو کہو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا۔ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔''[۲۹]

غالب کا دَور معاشی سیاسی اور سماجی ابتری کا دَور تھا۔ ان حالات میں وہ بیمار بھی رہتے، اپنے مرنے کی پیشین گوئی بھی کرتے اور تنگ دستی میں بھی رہتے۔ ان مصائب اور دقتوں کے باوجود بڑی خندہ پیشانی سے کمال حسن تحریر بھی لکھتے رہے۔ میرزا ''غدر'' کے بعد شدید مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ صاحب عالم مارہروی نے لکھا کہ والی حیدرآباد کے لیے قصیدہ کہیے تو اسے ایک متوسل کے ذریعے سے پیش کر دیا جائے گا۔ جواب میں لکھتے ہیں:

> ''میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کول بروک صاحب ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریذیڈنٹ معزول ہوئے۔ سکرٹر گورنمنٹ بہ مرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے پادشاہِ دہلی نے ۵۰ روپے مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں! اب میں جو والی دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور اگر احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔ اے خداوند بندہ پرور! یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں۔''[۳۹]

عہد غالب میں غربا و مساکین کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ اہل ثروت ان کے لیے وجہ معاش مقرر کر دیتے تھے اور ان سے دُعائے خیر کے طالب رہتے تھے۔ غالب کے خطوط میں مطرب اور گویے کے علاوہ بعض دوسرے پیشے کے لوگوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس معاشرت میں حقہ کا استعمال خاص طور پر امرو شرفا کے یہاں ہوتا تھا۔ بازاری پیشہ وروں میں ایک پیشہ بھاٹ کا بھی تھا جو گیت سناتا اور در در جا کر اور جھوٹی تعریف کر کے لوگوں سے پیسے وصول کرتا۔ بھاٹ کی صفت خوشامد

ہے اسی خوشامد کا ذکر غالب نے کیا ہے لیکن اپنی ذات کے لیے۔ بازار میں ہی پھیری والے ہوتے تھے اور وہ کتابیں لے کر گھومتے رہتے، اہل ذوق ان سے خریدتے۔ غالب کے بعض خطوط سے اس عہد میں کتابوں کی خرید وفروخت سے متعلق اہم باتوں کا علم ہوتا ہے۔

خطوط غالب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات، معاشرت اور اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جتنی اور جیسی معلومات غالب کے ان خطوط سے حاصل ہوتی ہیں، دوسرے ذرائع سے حاصل نہیں ہوتی۔ غالب نے تہذیبی اداروں اور معاشرتی کوائف کو اپنے خطوط میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

حواشی:

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ اَدب اُردو جلد دوم، لاہور: مجلس ترقی اُردو، ۲۰۰۹ء، ص: ۱۰۲۹

۲۔ عبدالحق، ڈاکٹر مولوی، مرحوم دہلی کالج، دہلی: انجمنِ ترقی اُردو (ہند)، ۱۹۴۵ء، ص: ۱۱۹

۳۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محاسنِ خُطوطِ غالب، لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۹ء، ص: ۱۵

۴۔ ایضاً، ص: ۶۹

۵۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، مجموعۂ مکاتیبِ غالب، مُرتّبہ پروفیسر نذیر احمد۔ غلام رسول مہر، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۱ء، ص: ۴۰۲۔۴۰۳

۶۔ ایضاً، ص: ۳۷۹

۷۔ ایضاً، ص: ۵۸۹

۸۔ ایضاً، ص: ۵۷۰

۹۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، غالب کے خطوط جلد دوم، مُرتّبہ خلیق انجم، نئ دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء، ص: ۵۳۶

۱۰۔ غالب، مرزا اسد اللہ خان، خطوطِ غالب، جلد اوّل، مُرتّبہ غلام رسول مہؔر، لاہور: مطبوعاتِ مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص: ۲۸۲

۱۱۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، مجموعۂ مکاتیبِ غالب، مُرتّبہ پروفیسر نذیر احمد۔ غلام رسول مہر، ص: ۲۷۵

۱۲۔ ایضاً، ص: ۲۷۵

۱۳۔ ایضاً، ص: ۳۳۵۔۳۳۶

۱۴۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، عود ہندی، مُرتّبہ مرتضیٰ حسین فاضل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۸۔۱۹۷

۱۵۔ ایضاً، ص: ۷۵۲

۱۶۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، مجموعۂ مکاتیبِ غالب، مُرتّبہ پروفیسر نذیر احمد۔ غلام رسول مہر، ص: ۴۳۷

۱۷۔ ایضاً، ص: ۴۴۵

۱۸۔ ایضاً، ص: ۶۹۱

۱۹۔ خلیق انجم، مُرتّب، غالب کے خطوط، جلد دوم، ص: ۵۱۴

۲۰۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، مجموعۂ مکاتیبِ غالب، مُرتّبہ پروفیسر نذیر احمد۔ غلام رسول مہر، ص: ۳۸۹

۲۱۔ ایضاً، ص: ۵۶۰

۲۲۔ ایضاً، ص: ۵۰۵

۲۳۔ ایضاً، ص: ۶۳۲

۲۴۔ ایضاً، ص: ۳۷۲۔۳۷۳

۲۵۔ ایضاً، ص: ۵۳۰۔۵۳۱

۲۶۔ ایضاً، ص: ۵۳۲

۲۷۔ ایضاً، ص: ۵۳۳

۲۸۔ ایضاً، ص: ۵۴۴

۲۹۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، عود ہندی، مُرتبہ سیّد مرتضیٰ حسین فاضل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء، ص: ۳۳۹

۳۰۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، مجموعہ مکاتیب غالب، مُرتبہ پروفیسر نذیر احمد۔ غلام رسول مہر، ص: ۷۹۱